رشید احمد جالندھری

اسلامی خلافت کیوں وجود میں آئی

[''اسلامی خلافت کیوں وجود میں آئی'' مرحوم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی معروف کتاب الفتنہ الکبری، عثمانؓ سے ماخوذ ہے۔ یہ مضمون، لاہور کے ایک مرحوم رسالے ''چٹان'' ۲۳۔ اپریل ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ خاکسار ان دنوں جامعہ الازہر قاہرہ میں تھا۔

ان دنوں قاہرہ کی ادبی اور ثقافتی زندگی میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ڈاکٹر احمد امین اور عباس محمود عقاد جیسے دانشمند چھائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین عرب دنیا میں بیسیوں صدی کے ابوالعلا معری تھے۔ تقریر اور تحریر دونوں کے 'بادشاہ'۔ تقریر کرتے تو بہ قول ڈاکٹر احمد امین ''محسوس ہوتا کہ طٰہٰ حسین ایک آسمانی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اور فرشتوں کی انگلیاں اس کے اوراق اُلٹ رہی ہیں۔'' ایک طرف طٰہٰ حسین اور ان کے ہم پایہ دانشمند ادب و ثقافت میں ایک نئی تاریخ رقم کر رہے تھے، تو دوسری طرف مرحوم جمال عبدالناصر کی انقلابی شخصیت نہر سویز میں برطانوی سیاست کا سفینہ ڈبو رہی تھی۔ جمال عبدالناصر کے بارے میں برطانوی وزیر اعظم ایڈن (جس نے ۱۹۵۶ء میں مصر پر حملہ کیا تھا۔) سویز جنگ سے متعلق اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اُنھوں نے مغرب کے رہنماؤں کو خفیہ خطوط لکھے تھے کہ اگر عبدالناصر کی گرفت نہ کی گئی تو اُن سے مغرب کو وہی نقصان پہنچے گا جو عربوں (کی نشات اولی) کے ابتدائی دنوں میں پہنچا تھا۔ جواہر لال نہرو کی خواہش پر جمال عبدالناصر نے نہرو-طٰہٰ حسین ملاقات کا انتظام کرایا تھا۔ قاہرہ کے ایک معروف ادبی مجلّہ میں تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔

طٰہٰ حسین عربی ادب کے ساتھ ساتھ یونانی، فرانسیسی اور اطالوی ادب کا بھی گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ اس لیے اُنھوں نے سب سے پہلے فلاسفۂ یونان پر اپنی کتاب 'قادۃ الفکر' میں سقراط، افلاطون اور دوسرے یونانی فلاسفہ پر تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ بات محتاجِ بیان نہیں

کہ عرب اور مسلم دُنیا نے اپنے دورِ عروج میں یونان کے فلسفہ و ادب پر عبور حاصل کر کے عرب اور مسلم معاشرے کو ایران و یونان کے بلند پایہ فکری و ادبی اور سیاسی سرمایہ سے روشناس کرایا تھا۔]

''مَیں سمجھتا ہوں کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) نے اسلامی خلافت کو ایک تجربے کے طور پر قائم کیا تھا۔ جس کے ذریعے وہ ایک بلند مقصد تک پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر یہ تجربہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ شیخین کی تمناؤں پر یہ تجربہ اس لیے پورا نہیں اُترا کہ جس عہد میں یہ تجربہ کیا گیا وہ اس کے لیے موزوں نہ تھا۔ اس زمانے کا ذکر کیا بلکہ آج بھی جب کہ انسانیت نے ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے نظریۂ حکومت کے بارے میں نئی نئی صورتوں کو جنم دیا ہے، لیکن پھر بھی وہ اس سیاسی اور اجتماعی عدل و انصاف کے حصول میں ناکام رہی، جس کے قیام کا ابوبکرؓ اور عمرؓ نے بیڑا اُٹھایا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ انسانیت نے قیامِ حکومت کے لیے مختلف راستوں کی خاک چھانی ہے۔ کبھی اسے استبدادیت سے واسطہ پڑا، جس میں ظالم اپنے آپ کو خدا، یا ظلِّ خدا سمجھتے تھے۔ ان ظالم بادشاہوں کے دور میں انسانیت نے بڑے دُکھ اُٹھائے۔ کیونکہ ملوکیت کو اس امر سے کوئی تعلق نہیں تھا کہ وہ اپنے قوانین میں مخلوقِ خدا کا پاس رکھے۔ بلکہ اس کے قوانین تو فقط اس کے ذاتی مفاد کے تابع ہوتے تھے۔ یہ دور ختم ہوا تو ارستقراطیت (اشراف کا طبقہ) کا عہد طلوع ہوا۔ جس میں عدل و انصاف کا حق صرف ایک خاص گروہ (اشرافیہ) کو دیا گیا۔ ارستقراطیت کا سورج غروب ہوا--- تو ڈکٹیٹرشپ کا عہد شروع ہوا۔ جس میں ظلم وستم کو پہلے سے کہیں زیادہ ''عروج'' حاصل ہوا۔ اس دور میں لوگوں کی عزت وشرافت پر ذلت و مسکنت کے پہرے بٹھا دیئے گئے۔ یہ دور ختم ہوا، تو دوسرے دور نے جنم لیا جس میں یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ پوری قوم میں معاشرتی عدل و انصاف کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کے پورے

اختیارات قوم ہی کے ہاتھ میں ہوں اور قوم اپنے لیے جن قوانین کو پسند کرے وضع کرے اور ان کی تنفیذ کے لیے وہی لوگ مامور ہوں جن کا قوم نے خود انتخاب کیا ہو۔

بلاشبہ اس نظام سے انسانیت نے کسی قدر سماجی انصاف پایا۔ آزادی ومساوات سے اسے حصہ ملا۔ مگر معاشرتی عدل وانصاف اس نہج پر قائم نہ ہو سکا کہ اس سے قوم کے تمام افراد کو اپنا حق ملتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نظام میں منتخب ہونے والے نمائندوں میں وہ لوگ بھی تھے جو حرص وآز کے بندے تھے۔ وہ دُنیاوی مفاد کے لیے جادۂ اعتدال سے ہٹ کر انہی راہوں پر چلتے تھے، جن پر کبھی ملوکیت، ارستقراطیت اور دکتاتوریت (ڈکٹیٹرشپ) چل چکی تھی۔

یہی وہ سماجی عدل وانصاف تھا، جس کے لیے اشتراکیت وجود میں آئی۔ ہر چند اشتراکیت نے معاشرے میں طبقاتی کشمکش کو ختم کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ کام کرنے والے ہاتھوں کو اس امر کا حق دیا کہ وہ اپنے اعمال کا پھل خود بھی کھا سکیں اور عام شہری ذلت وخواری اُٹھائے بغیر زندگی بسر کر سکیں۔ مگر اس نظام نے لوگوں کی آزادی کو سلب کر لیا۔ ان کی آواز کو دبایا گیا۔ اور یہ آزادی اس حد تک سلب کی گئی تھی کہ آج اس نظام کے دیوتا خود چیخ اُٹھے ہیں کہ اُنہوں نے ماضی میں انسانیت کے چہرے کو مسخ کر دیا تھا۔ [سٹالن اُن کی نظر میں دُنیا بھر کے محنت کش مزدوروں کا عظیم ''پیغمبر'' تھا۔ کہتے ہیں جب مارچ ۵۶ء کو کامریڈ خروشیف نے ماسکو میں کمیونسٹ پارٹی کے ایک اجلاس میں سٹالن کے جرائم پر مشتمل ایک طولانی فہرست کو پڑھا تو اسے سُن کر تیس اشتراکی ممبر بے ہوش ہو گئے تھے۔]

بہرحال اشتراکیت نے انسان کی متاعِ عزیز (آزادئ رائے کے اظہار) کو چھینا ہے اور وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا جسے اشتراکیت کے خالق نے دیکھا تھا۔ ابھی انسانیت کو اشتراکیت کی قہرمانیوں سے نجات نہیں ملی تھی کہ اس پر ایک دوسری مصیبت ''فاشسزم'' (Fascism) کی صورت میں سامنے آ گئی۔ جس نے انسان کو سماجی عدل وانصاف اور آزادی دونوں ہی سے محروم کر دیا۔

انسانیت نے اپنے حصولِ مقصد کے لیے متعدد نظامہائے حکومت کو استعمال کر کے

خلافت میں حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلیں۔ مسلمانوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد معاشرے میں عدل و انصاف کا قیام تھا اور یہی وہ سماجی عدل و انصاف کا اصول تھا جو شیخین (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ) کے ہاں حکومت کا بنیادی اصول تھا۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلامی دعوت کے بنیادی اصول دو تھے۔

۱۔ توحید

۲۔ بنی نوع انسان میں امتیازی تفریق کا خاتمہ

''یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی. الخ'' (الحجرات:۱۳)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی دعوت قریشِ مکہ کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی کہ آپ نے بندہ و آقا، امیر و غریب، عرب اور غیر عرب کے درمیان مساوات کا نعرہ کیوں بلند کیا ہے؟ اور یہی وہ مساوات کا نعرہ تھا جس سے تاریخِ انسانی میں ایک نیا موڑ آیا۔ تمام انسان خدا کی نگاہ میں برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر وطن، نسل اور زبان کی بنیاد پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ مشرکینِ مکہ رسولِ کریم صلعم کے ذاتی اوصافِ حمیدہ کے اعتراف کے باوجود آپ کی اس دعوت کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے کہ معاشرے کے تمام افراد آپس میں یکساں حیثیت کے مالک ہیں۔

میرا (طٰہٰ حسین) اعتقاد ہے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کو صرف اللہ کی طرف بلاتے اور آپ اُن کے اجتماعی اور اقتصادی نظام سے کوئی سروکار نہ رکھتے تو شاید قریش آپ کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتے اور آپ کے درپئے آزار نہ ہوتے کیونکہ قریش اپنے بتوں سے بھی اخلاص نہ رکھتے تھے۔ بتوں سے ان کی نیازمندی اور خلوص اسی حد تک تھا کہ وہ اس میں اپنا ذاتی، مادی فائدہ تصور کرتے تھے۔

ان کے نزدیک بتوں کی پوجا بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں تھا۔ بلکہ یہ بت اُن کے لیے جلبِ زر کا ایک وسیلہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مشرکین کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ وہ

ارض وسما کے خالق کے منکر ہیں۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ وہ اپنے اصلی خالق کے اقرار کے ساتھ ساتھ بتوں کو بھی اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ یہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں ان بتوں سے کیا غرض، ہم تو اُن کی صرف اس لیے پوجا کرتے ہیں کہ اس طریق سے ہم اللہ کے نزدیک ہوسکیں۔ اور یہ بت ہمارے سفارشی ہیں۔ ما نعبد هم إلا لِيقربونا الى الله زلفا. (الزمر:۳)

بہرحال قریش اپنے بتوں کی مذمت سننے پر اس قدر ناراض نہیں تھے جس قدر کہ وہ اپنے سماجی نظام پر تنقید سے۔ اور یہ بات تو کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلامی کے سلسلہ میں ایک دفعہ قریش کے سرداروں سے اس حد تک نرمی فرمائی کہ بعض نادار مسلمانوں کی طرف دھیان نہ فرمایا۔ آپ کی یہ بے التفاتی اللہ کے ہاں ناپسند کی گئی، جس کی خبر ''سورۂ عبس'' کے ذریعے سے آپ کو دی گئی۔

اس سورت سے جہاں اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ رسولِ کریمؐ رسولِ حق ہیں۔ اگر آپ رسولِ حق نہ ہوتے تو اپنے ہی بارے میں ایسی آیات کی تخلیق کیونکر کر سکتے تھے، جن میں آپ کی اپنی فروگزاشت کا ذکر ہو۔ یہ آیات اس بات کی دلیل ہیں کہ قرآن مجید رسولِ کریمؐ کی ذہنی اختراع کا نتیجہ نہیں بلکہ خدائی کلام ہے۔

رسولِ کریم صلعم نے اپنی مکی اور مدنی زندگی میں اپنے ساتھیوں کے درمیان رہتے ہوئے تمام امور میں عدل و انصاف کا اس حد تک خیال فرمایا کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات جاگزیں ہوگئی کہ توحید، مساوات اور عدل و انصاف کا قیام اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ یہی عقیدہ تھا جس کی بنا پر جنگِ حنین میں ایک مسلمان نے رسولِ کریم صلعم سے کہا، آپ مالِ غنیمت کی تقسیم میں انصاف کیجیے۔'' پہلی مرتبہ تو آپ نے اس آواز پر دھیان نہ فرمایا۔ مگر جب یہ آواز دوبارہ بلند ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ ''تیرا برا ہو، اگر مَیں انصاف نہ کروں تو پھر کون ہے جو انصاف قائم کرے گا؟'' بعض مسلمانوں نے اس ''گستاخ'' کو سزا دینا چاہی مگر آپ نے روک دیا۔ کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے ساتھی کے حقِ تنقید یا اس کی آزادی کو چھین لیں۔ مگر خود رسولِ کریم صلعم کا یہ فعلِ مبارک اس لیے جائز تھا کہ آپ کو سورۂ ''برأۃ'' میں اس کی اجازت مل

چکی تھی۔

سیرتِ طیبہ کے قارئین جانتے ہیں کہ آپ نے ان امور کے علاوہ جن میں اللہ نے آپ کو امتیازی درجہ عطا فرمایا تھا، کبھی بھی اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں پر ترجیح نہیں دی تھی۔ آپ کی پاکیزہ سیرت ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، جس کے ہر ورق پر ثبت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ تمام امور میں برابر کے شریک تھے۔ جنگ ہو یا صلح، مسجد کی تعمیر ہو یا خندق کی کھدائی۔ ان سب میں آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ برابر مشقت برداشت کرتے رہے۔ اگر آپ کے بہادر اور جانثار ساتھیوں نے پتھر کی سلیں اور مٹی کی ٹوکریاں اُٹھائیں ہیں تو آپ نے بھی مسکراتے اور گنگناتے ہوئے برابر ان کاموں میں حصہ لیا۔ حالانکہ آپ کو اللہ نے اپنی نبوت اور وحی کے لیے منتخب فرمایا تھا۔

رسولِ کریم صلعم نے اپنے عمل سے مساوات کا درس دیا، اس عظمت و جلالت کے مالک ہوتے ہوئے کہ خود عظمت کو اپنے تئیں ناز ہے کہ اس کا تعلق آپ جیسے ''انسانِ کامل'' سے ہے۔ آپ جب اس دُنیا سے تشریف لے گئے تو اپنے پیچھے کچھ نہ چھوڑا بلکہ فرمایا تھا کہ:

''ہماری انبیاء کی جماعت جو چیز ترکے میں چھوڑتی ہے، صدقہ بن جاتی ہے۔ ہم کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے۔''

یہی وہ قولِ مبارک تھا جس کی بنا پر آپ کی چہیتی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا باغِ فدک سے محروم ہو گئی تھیں۔ آپ کی یہی وہ پاک سیرت ہے جس نے ہمیں بتایا کہ آپ نے زندگی بھر اپنے اہلِ بیت، صحابۂ کرامؓ اور دوسرے عوام الناس کے درمیان عدل و انصاف کی میزان کو برقرار رکھا ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد آپ کے دونوں ساتھی مقدور بھر آپ کی سیرتِ طیبہ پر چلے۔ بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تو اپنی بساط سے زیادہ مشقت برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ چنانچہ آپ نے امورِ خلافت کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ کسبِ معاش کے لیے وہی طریقہ جاری رکھا جو قبل از خلافت تھا۔ مسلمانوں کو جب اس بات کا علم ہوا کہ آپ

''تکلیف مالا یطاق'' کے دَور سے گزر رہے ہیں تو اُن کا دل بھر آیا۔ بلکہ خود آپ نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ ایک ہی وقت میں خلافت اور معیشت کے امور سلجھانا مشکل ہے۔ چنانچہ اپنے ساتھیوں کے اصرار پر آپ نے بیت المال سے اسی قدر امداد لینا قبول کی جو آپ اور آپ کے خاندان کے لیے کفیل تھی۔ ''حضارۃ العرب'' میں لکھا ہے کہ یہ امداد صرف پانچ درہم یومیہ تھی۔''

ابوبکرؓ کی بلند شخصیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنی وفات کے وقت اس بات کو بُرا جانا کہ وہ خدا سے ملیں اور ان کے گھر میں بیت المال کی کوئی چیز موجود ہو۔ چنانچہ آپ نے اپنے گھر والوں کو یہ وصیت کی کہ بیت المال کی جو چیز اُن کے ہاں موجود ہے اسے عمرؓ کے سپرد کر دیا جائے--- صدیقِ اکبرؓ کی وفات کے بعد جب یہ سامان حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا تو اسے اپنی تحویل میں لیتے وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے عمرؓ کو روکا کہ وہ اس سامان کو واپس نہ لیں۔ مگر عمرؓ نے اس خیال سے لے لیا کہ ابوبکرؓ اپنے رب سے کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ اُنہوں نے تو اپنے خاندان والوں کو بیت المال کی چیزیں واپس کر دینے کی وصیت کر دی تھی، مگر عمرؓ نے اسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔

آپ کے بعد حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا۔ خلافتِ فاروقی کی عمر دس سال سے زیادہ ہے۔ مگر اس پورے دور میں حضرت عمرؓ نے قوم کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جو اُنہیں رسولؐ اور اُن کے پیش رو ساتھی حضرت صدیقِ اکبر سے ورثہ میں ملا تھا۔ آپ قوم کے رنج و غم میں برابر کے شریک رہے۔

آپ نے ایک دفعہ یہ محسوس کیا کہ قحط سالی کی وجہ سے لوگ گھی کا استعمال نہیں کرتے۔ تو آپ نے بھی گھی چھوڑ کر تیل کا استعمال شروع کر دیا، جس سے آپ کی صحت پر بُرا اثر پڑا، رنگ تک پھیکا پڑ گیا۔ مگر مسلمان حضرت عمرؓ کو تیل کے استعمال سے نہ روک سکے۔ کیونکہ آپ نے نہایت ہی وضاحت سے یہ فرمایا تھا کہ وہ اس وقت تک ''مرغن غذائیں'' نہیں کھا سکتے جب تک عوام الناس قحط سے نجات پا کر خوشحال نہ ہو جائیں۔ کاش! آج کے اہلِ اقتدار اپنی ہی تاریخ کی روشنی میں اپنے قول و عمل کا جائزہ لیں۔ اپنی تاریخ سے نہ سہی عہدِ حاضر کی تاریخ ہی

سے کوئی سبق لیں۔ [کہتے ہیں کہ لینن نصف روٹی کھاتا تھا، کیوں کہ اس کے اندازہ کے مطابق اس وقت کے مزدوروں کو نصف روٹی میسر آتی تھی۔]

حضرت عمرؓ نے احتساب کا یہ سلوک اپنے نفس کے ساتھ ہی روانہیں رکھا بلکہ اپنے خاندان والوں کا گہری نظر سے جائزہ لیتے رہے کہ کہیں وہ اس قحط سالی میں خوشحالی کی زندگی تو بسر نہیں کر رہے بلکہ آپ نے ان کو ایک دفعہ بلا کر تنبیہ کی تھی کہ اُنھوں نے فلاں فلاں امور کے ارتکاب پر سزا دینے کا اعلان کیا ہے، اگر تم میں سے کسی نے ان امور کا ارتکاب کیا تو اس پر تمھیں دگنی سزا دی جائے گی۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں یہ ثابت کر دیا کہ رسولِ کریم صلعم کی پاکیزہ سیرت ان کے لیے مشعلِ راہ ہے اور آپ نے اسی کی روشنی میں لوگوں میں مساوات اور عدل و انصاف کو قائم کیا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ جہاں صحابہ کرام سے مشورے لیتے تھے جو آفتابِ رسالت سے براہِ راست مستنیر ہو چکے تھے، وہاں ان صحابہ کو مدینہ سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔

حضرت عمرؓ کو یہ خوف تھا کہ کہیں یہ صحابہ ملک کے دوسرے حصوں میں جا کر اپنی دینی وجاہت سے عام مسلمانوں کو فتنہ میں نہ ڈال دیں۔ جس سے ایک ہی وقت میں پوری ملت، حکومت اور صحابہ کی جماعت کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑے۔ [آپ کا یہ خطرہ درست تھا کہ صحابہ کی دینی وجاہت ''چودھراہٹ'' کا رنگ اختیار کر لے گی جو عوام الناس کے لیے بلائے بے درماں ہے۔ اس خطرے کی جیتی جاگتی وہ بیسیوں تصویریں ہیں جو آج پاک و ہند اور خاص کر پنجاب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو حسب، نسب اور مذہبی پیشوائی کے نام سے اپنا کاروبار کر رہی ہیں۔]

صحابۂ کرام بیت المال سے اپنا حصہ لینے کے علاوہ تجارت بھی کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ثروت سمٹ سمٹ کر ان کے پاس آنے لگی۔ حضرت عمرؓ اس امر میں متردد تھے کہ اس نئی صورتِ حال کا سامنا کس طرح کریں۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں

بھی آزادانہ تجارت کرتے تھے۔ مگر آپ اِس نئی صورتِ حال سے مطمئن نہ ہوئے اور کہہ اُٹھے کہ اگر ان کی حکومت واپس آ جائے تو وہ امراء سے ان کا زائد مال لے کر غریبوں میں بانٹ دیں گے۔ (۱)

چنانچہ آپ نے یہ اعلان کر دیا کہ بیت المال قوم کا مشترکہ اثاثہ ہے۔ جس میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں ہے۔ آپ نے طبقاتی تمیز کو ختم کر کے سوسائٹی کے ہر مرد، عورت، بچے، بوڑھے، مریض اور بے بس لوگوں کے لیے بیت المال سے وظیفے مقرر فرمائے۔

ان وظیفوں میں صرف مسلمان ہی شریک نہیں تھے بلکہ غیر مسلم نادار اور بے بس لوگ بھی شریک تھے۔ آپ نے ایک دفعہ مدینہ میں ایک غیر مسلم نابینا کو دیکھا جو فلک زدہ تھا۔ آپ نے تمام صورتِ حالات کا جائزہ لینے کے بعد کہا کہ قرآن میں ''صدقات'' کے مصارف میں سے ''مساکین'' بھی ہیں تم انہی مساکین کے ایک فرد ہو۔ چنانچہ ایک غریب غیر مسلم شہری کا ''شعبۂ زکوٰۃ'' سے وظیفہ مقرر کیا گیا۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ میں حصہ پانے والوں میں ''فقرا'' کا بھی ذکر آیا ہے۔ [علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر ''احکام القرآن'' میں غیر مسلم غریبوں کو بھی ''فقرا'' میں شمار کیا ہے۔ جنہیں زکاۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔]

معاشرے میں قیامِ عدل کے لیے کی جانے والی تاریخی مساعی کے باوجود ایک رات کسی محلے سے گزر رہے تھے کہ ایک بچے کے رونے کی آواز آئی جسے آپ نے دوسری اور تیسری رات بھی سنا۔ آپ نے اس بچے کی ماں سے رونے کا سبب پوچھا تو ماں نے بتایا کہ وہ

---

(۱) ''لو استقبلتُ ما استدبرتُ لا خذتُ فضول أموال الأغنياء و وزّعتُها بين الفقراء''
اسلامی جمہوریہ ایران کے سابق صدر ابوالحسن بنی صدر نے اپنی کتاب "Islamic Government" میں لکھا ہے: ''آغازِ اسلام میں جب اقتدار ملا، تو دولت نے عربوں کی طرف رُخ کیا اور لوگوں نے بڑے بڑے مکانات بنائے، تو حضرت عمر نے کہا: اگر میں ایک سال اور زندہ رہ گیا تو یہ دو دو منزلہ مکانوں کو جو دوسروں سے ممتاز نظر آ رہے ہیں، مسمار کر دوں گا۔ (ص ۸۲)
دیکھئے ایران کے پہلے صدر جناب بنی صدر کی انگریزی کتاب "The Principles And Precepts of Islamic Government" Lexington, K.Y. 40501, U.S.A.

اپنے بیٹے کو دودھ چھوڑنے پر مجبور کر رہی ہے۔ کیونکہ عمر انہی بچوں کا وظیفہ مقرر کرتے ہیں جو دودھ نہ پیتے ہوں۔ آپ اس بات کو سن کر سکتے میں آ گئے۔ دوسرے دن اعلان کیا کہ دودھ پیتے بچوں کو بھی وظیفہ دیا جائے گا۔ اس لیے کسی بچے کو ماں کا دودھ چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

آپ کے اس اجتماعی نظام سے جو پوری سوسائٹی کے لیے خیر و برکت کا سبب تھا، یہ نہ سمجھا جائے کہ آپؓ بیسویں صدی کے کوئی ''اشتراکی لیڈر'' تھے۔ آپ نے اپنے نظامِ خلافت کی بنیاد انہی اصولوں پر رکھی جن کی رہنمائی اسلام اور پیغمبر اسلام نے کی تھی۔ آپ نے سماجی انصاف کو ذاتی ملکیت (جاگیرداری نہیں) اور ثروت (سرمایہ داری نہیں) کو منسوخ کیے بغیر قائم کیا اور آج کی نئی جمہوری حکومتیں بھی---''بعد از خرابیٔ بسیار'' اسی اخلاقی اور تاریخی روایت کی طرف آ رہی ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلام کی دعوت کا پہلا رُکن توحید ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی بندگی کے لائق نہیں ہے۔ اور دوسرا اہم رُکن معاشرتی اور اجتماعی عدل و انصاف کا قیام ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں نے اپنی خلافت کی ''غایت الغایت'' اسی رکن کو بنائے رکھا۔ اور اس اخلاقی ذمہ داری کے گہرے احساس کے ساتھ مسند خلافت کو قبول کیا کہ جہاں ان کے اعمال کا محاسبہ قدرت کی آنکھ کر رہی ہے وہاں مخلوق کا یہ عزم بھی ان کے لیے مشعلِ راہ ہے کہ اُن (حاکم) کی ''ہر کجی کو تلوار کی نوک سے درست کر دیا جائے گا۔''